رموز بیخودی کی تصنیف
مکاتیب اقبال کی روشنی میں ایک مطالعہ

حسنین عباس

رموز بیخودی کی تصنیف صرف شعر برائے شعر کا نتیجہ نہیں بلکہ علامہ اقبال کے فکری عمل کے تسلسل کا نتیجہ ہے۔ اسرار خودی کی اشاعت کے بعد اس کے بارے میں بہت سی آراء اور مضامین شائع ہوئے جس پر علامہ اقبال نے ناگزیر سمجھا کہ وہ اسرار خودی کے مضامین کی تکمیل کے طور پر رموز بیخودی کو تصنیف کریں۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی قوم کو موضوع کلام بناتی ہے۔ مختلف مراحل پر علامہ نے رموز بیخودی کے لیے جو نام سوچے وہ بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں۔ مورخہ ۶ فروری ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی کے نام خط میں رموز بیخودی کے لیے اسرار حیات، پیام سروش، پیام نو اور آئین نو جیسے ناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ علامہ اس خط میں لکھتے ہیں:

> ڈیئر خواجہ صاحب! آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے، اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے جو ہے۔ اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام ''اسرارِ حیات''، ''پیامِ سروش''، ''پیامِ نو''، ''آئین نو'' تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائج سے مجھے مطلق کیجیے تاکہ مَیں انتخاب کرسکوں۔[۱]

رموز بیخودی کے مضامین اور انداز بیان بتاتا ہے کہ پوری کتاب میں علامہ نسبت رسالتؐ کے وقار میں ہیں اور جذبہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار۔ یہ جذبہ اور نسبت انہیں اپنے والد شیخ نور محمد سے عطا ہوئی ہے۔ رموز بیخودی میں ایک ایسا قطعہ علامہ نے نظم کیا ہے، جو ان دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے والد کا یہ معمول تھا کہ جب بھی انہیں کسی بات سے ٹوکتے یا ان کو کچھ کرنے سے منع کرتے تو ہمیشہ قرآن مجید یا اسوۂ رسول کی سند سے پند و نصیحت فرماتے۔ اقبال ان کے منہ سے جب قرآن مجید کی کوئی آیت یا حدیث آنحضور سنتے تو چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کیے بغیر خاموش ہو جاتے۔ اقبال خود بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو روزانہ صبح اٹھ کر تلاوت قرآن کیا کرتے، مگر ان کے والد اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور انہیں دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح

سویرے ان کے قریب سے گزرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔ بالآخر انہوں نے کچھ مدت بعد اقبال کے اصرار پر وہ بات بتا دی۔ ایک دن صبح جب اقبال حسب دستور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے تو وہ ان کے پاس آئے اور شفقت سے فرمایا: بیٹا! مجھے کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے، یعنی اللہ خود تم سے ہمکلام ہے۔[۲]

علامہ اقبال کی تربیت کے حوالے سے ڈاکٹر جاوید اقبال ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

ایک دفعہ کوئی سائل بھیک مانگتا ہوا ان کے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا اور باوجود یکہ اسے کئی بار جانے کے لیے کہا گیا، وہ اڑیل فقیر ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اقبال ابھی عنفوان شباب میں تھے۔ اس کے بار بار صدا لگانے پر انہیں طیش آ گیا اور اسے دو تین تھپڑ دے مارے۔ جس کی وجہ سے جو کچھ اس کی جھولی میں تھا، زمین پر گر کر منتشر ہو گیا۔ والد ان کی اس حرکت پر بے حد آزردہ ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فرمایا: قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد غازیانِ اسلام، حکماء، شہدا، زہاد، صوفیہ، علماء اور عاصیانِ شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گدا کی فریاد آنحضور کی نگاہِ مبارک کو اپنی طرف مرتکز کر لے گی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے پوچھیں گے کہ تیرے سپرد ایک مسلم نوجوان کیا گیا تھا تا کہ تو اس کی تربیت ہمارے وضع کردہ اصولوں کے مطابق کرے، لیکن یہ آسان کام بھی تجھ سے نہ ہو سکا کہ اس خاک کے تودے کو انسان بنا دیتا، تو تب میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا؟ بیٹا! اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی دیکھ اور دیکھ، میں خوف اور امید سے کس طرح کانپ رہا ہوں، باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور خدا را میرے مولاؐ کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کر۔ تو تو چمن محمدیؐ کی ایک کلی ہے، اس لیے اسی چمن کی نسیم سے پھول بن کر کھل، اور اسی چمن کی بہار سے رنگ و بو پکڑ، تا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کی خوشبو تجھ سے آ سکے۔[۳]

علامہ پر اپنے والد کی روحانی شخصیت کا کتنا گہرا اثر تھا اس کا اندازہ حیات اقبال کے ایک موقع سے ہوتا ہے۔ ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں، انہیں اقبال نے خود بتایا:

جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا۔ میں نے کیا دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں۔ میں فوراً اپنے بستر سے اٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا جو آدھ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ والدہ اس دروازے میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا تا کہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انہیں اپنا ایک رؤیا سنا رہے تھے، جو رات انہوں

نے بہ حالتِ بیداری دیکھا تھا۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلہ پر مقیم ہوا ہے۔ اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے۔ لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگا منگایا۔ مجھے بھی ساتھ بٹھالیا اور چل دیے۔ چند گھنٹوں میں تانگا اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں کارواں کا ڈیرا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے، جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے پنجاب آئے ہیں۔ والد نے تانگے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔ سالار بے حد متعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے، لیکن وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ہے، اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی۔ وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ہو گی۔ اس وقت تو نہ مجھے یقین آیا نہ مریض کے لواحقین ہی نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی، لیکن چوبیس ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے۔[۴]

عطیہ فیضی نے اپنی انگریزی تصنیف بعنوان اقبال میں اس واقعے کو بعینہٖ اسی انداز میں تحریر کیا ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ اقبال کے والد نے کسی ولی کی رہنمائی میں کئی ماہ تنہائی میں گزارے تھے اور انہیں جو کچھ حاصل ہوا، بیٹے کو دیا۔[۵]

رموز بیخودی کا اختتام بھی اقبال کی شخصیت کے اس پہلو اور رموز بیخودی کی مجموعی فضا کی تائید کرتا ہے۔ رموز بیخودی کے آخر میں ''حضور رحمۃ للعلمین ﷺ میں عرض حال کرتے ہوئے انہوں نے تحریر کیے:

مدتے با لالہ رویاں ساختم
عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغِ عافیت داماں زدم

برقہا رقصید گردِ حاصلم
رہزناں بروند کالائے دلم
ایں شراب از شیشہ جانم نہ ریخت
ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت[۶]

ایک مدت تک میں نے حسینوں سے راہ و رسم رکھی اور گھنگریالے بالوں والے محبوبوں سے عشق کرتا رہا۔ ماہ رخوں کے ساتھ میں نے شراب کے جام لنڈھائے اور اطمینان وسکون کا چراغ بجھاتا رہا۔ میرے خرمن کے گرد بجلیاں رقص کرتی رہیں اور ان رہزنوں نے میرے دل کی دولت لوٹ لی۔ مگر اس تمنا کی شراب میری جان کے جام سے نہ نکل سکی۔ یہ زرِ خالص میرے دامن میں محفوظ رہا۔

رموز بیخودی اقبال کے ملی افکار کے تسلسل کی وہ کڑی ہے جو ان کی فکری کائنات میں فرد اور قوم کو جمع کرتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بقول:

وہ اپنی ادبیات میں روح پیدا کرنے کی غرض سے کوئی نیا سرمایہ حیات فراہم کرنا چاہتے تھے اور بالآخر ۱۹۱۰ء میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں اور انہی خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے مثنوی اسرار خودی لکھنا شروع کی۔ اقبال کی تحریروں سے یہ بھی واضح ہے کہ اپنے والد کی فرمائش پر بوعلی قلندر کی مثنوی کی طرز پر ایک مثنوی لکھنا چاہتے تھے۔ بوعلی قلندر سے تین مثنویاں منسوب ہیں۔ پہلی مخزن معنوی ہے، دوسری کلام قلندری کہلاتی ہے اور تیسری کا کوئی نام نہیں، اور اسے صرف مثنوی بوعلی قلندر قرار دیا گیا ہے۔ غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اقبال اور ان کے والد کے پیشِ نظر یہی آخری مثنوی ہو، اور طرز سے مقصود صرف بحر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابتداء میں مختصر مثنوی لکھنے کا خیال ہو، لیکن جب موضوع پر غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا تو مزید مطالب سامنے آئے اور مثنوی کو پھیلانا پڑا، یہاں تک کہ وہ اس کے تین حصے لکھنا چاہتے تھے مگر صرف دو لکھ سکے۔ اس وقت رومی ان کے سامنے آئے اور ان کی مثنوی سے انتساب مناسب سمجھا گیا۔ نیز رومی مختلف مرحلوں میں ان کی فکری اور روحانی رہبری کرتے رہے۔ پس غلام رسول مہر کی رائے میں حقیقی اسلامیت کی بیداری کے لیے نظامِ فکر کی ترتیب نے ان کے ذہن میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ شروع میں اس کی حیثیت کچھ تھی۔ پھر نئے نئے پہلو سامنے آتے رہے، حتیٰ کہ دو مثنویوں کا خاکہ ان کے ذہن میں مکمل ہو گیا۔ ایک کا تعلق حیات فرد سے تھا اور اس کا نام اسرارِ خودی رکھا، دوسری کا تعلق حیات ملت سے تھا، لہٰذا اسے رموز بیخودی سے موسوم کیا گیا، لیکن تیسری کو، جس کا موضوع حیات مستقبلۂ اسلامیہ تھا، ضبطِ تحریر میں نہ آسکی۔[۷]

ڈاکٹر جاوید اقبال اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقبال کے تصور انفرادی اور اجتماعی خودی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہی ان کے فکر کا محور ہے، لیکن اس

مسئلے پر اقبال کے نظریات کی حتمی شکل وہی رہی جو ان کی مثنویوں، اسرار خودی اور رموز بیخودی میں ملتی ہے۔ اقبال کے ہاں طاقتور انسانی شخصیت کی بہت اہمیت ہے، بلکہ وہ انسان ہی کے متعلق سوچتے ہوئے خدا تک پہنچے تھے۔ فرماتے ہیں: ''کمزور اپنے آپ کو خدا میں گم کرتے ہیں۔ طاقتور اسے اپنے اندر ڈھونڈ نکالتے ہیں''۔[۸]

مکاتیب اقبال کا مطالعہ اسرار خودی کی اشاعت کے بعد رموز بیخودی کی تصنیف کے اس محرک کی وضاحت کرتا ہے کہ فرد کی تعمیر خودی کے بعد علامہ قوم کی اجتماعی خودی کی تعمیر کے لیے کتنے فکر مند تھے۔ سراج الدین پال کے نام خط میں مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، تو اُسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاطِ ملی نے اُن کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے، جس سے انحطاط کا مسحور، اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے، یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے، مگر ہمیں اپنے ادائے فرض سے کام ہے۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میں مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ اس حصہ میں بعض باتوں پر مزید روشنی پڑے گی۔[۹]

سراج الدین پال کے نام خط میں مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:

اس نقطۂ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اگر آپ حافظ پر لکھیں تو اس نقطۂ خیال کو ملحوظ رکھیں۔ جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے تو آپ کو عجیب وغریب باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس واسطے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعے میں آپ کا دماغ ایک خاص رستے پر پڑ جائے۔ ان شاء اللہ اسرارِ خودی کے دوسرے حصے میں بتاؤں گا کہ شعر کا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟[۱۰]

۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کو حافظ محمد اسلم جیراج پوری کے نام خط میں لکھتے ہیں:

آپ کا تبصرہ اسرارِ خودی پر الناظر میں دیکھا ہے جس کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں۔ ''دیدمت مردے دریں قحط الرجال''۔[۱۱]

۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین موسیو مسیگنان ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں۔ ان شاء اللہ معارف کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی، اس واسطے بہت کم لکھتا ہوں۔ مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ یعنی رموزِ بیخودی (اسرارِ حیاتِ ملیۂ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے۔ شایع ہونے پر ارسالِ خدمت کروں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۱۲]

۲۸ر اپریل ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ رموزِ بیخودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے۔ انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔ مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔ اسرارِ خودی کی دوسری ایڈیشن تیار کر رہا ہوں، عنقریب آپ کی خدمت میں مرسل ہوگی۔[۱۳]

علامہ ۹ جنوری ۱۹۱۷ء کو مولوی الف دین کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

مثنوی اسرارِ خودی کے دوسرے حصہ کا قریب پانچ سو شعر لکھا گیا ہے مگر ہاتف کبھی کبھی دو چار ہوتے ہیں، اور مجھے فرصت کم ہے۔ امید کہ رفتہ رفتہ ہو جائیں گے۔ ہجرت کے مفہوم کے متعلق جو چند اشعار لکھے ہیں، عرض کرتا ہوں تا کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ یہ کیا چیز ہوگی۔[۱۴]

یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو سرکشن پرشاد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

اسی تنہائی میں مثنوی اسرارِ خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے جس کا نام ہوگا "اقلیمِ خاموشاں"۔ یہ نظم اُردو میں ہوگی اور اس کا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ مُردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں۔ ان کے عام حالات و جذبات و خیالات کیا ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ دو باتیں میری تنہائی کی کائنات ہیں۔[۱۵]

۱۹ مئی ۱۹۱۷ء کو سرکشن پرشاد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

میں فارسی مثنوی کے دوسرے حصے کی تکمیل میں مصروف ہوں، اس کا نام رموزِ بیخودی ہوگا۔[۱۶]

سرکشن پرشاد ہی کو مورخہ یکم فروری ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

انگلستان کے پروفیسر نکلسن جنھوں نے دیوان شمس تبریز کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، (کشف المحجوب حضرت علی ہجویری کا بھی انھی بزرگ نے انگریزی ترجمہ کیا ہے) مجھ سے اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں مگر کوئی نسخہ مثنوی اُن کے پاس نہیں، جو ہے انھوں نے کہیں سے عاریتاً لیا ہے۔ آج اُن کا خط آیا تھا جس میں وہ مثنوی کا نسخہ مانگتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی نسخہ نہیں سوائے ایک نسخے کے جس پر میں نے بہت سی ترمیم کر رکھی ہے جو دوسرے اڈیشن کے لیے ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے سرکار کی خدمت میں چند نسخے ارسال کیے تھے۔ غالباً آپ نے احباب میں تقسیم کر دیے ہوں گے۔ اگر کوئی کاپی باقی رہ گئی ہو اور سرکار کو اس کو ضرورت نہ ہو تو مرحمت فرمایئے، میں نہایت شکر گذار ہوں گا اور پروفیسر صاحب کو لکھ دوں گا کہ نسخہ سرکار سے دستیاب ہوا ہے۔

اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی زیرِ طبع ہے، فروری یا مارچ میں شائع ہو جائے گا۔ تو آپ کے ملاحظہ کے لیے ارسال ہوگا۔ تیسرے حصے کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی منطق الطیر ہوگی۔[۱۷]

مکاتیب اقبال سے رموز بیخودی کی تصنیف کی فنی و ادبی حیثیت کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ جب رموز بیخودی چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچی تو ان کی طرف سے اس پر آراء کا اظہار کیا گیا، تبصرے لکھے گئے اور کئی اعتراضات بھی کیے گئے۔ اب علامہ نے ان اعتراضات کے جوابات دیئے، مختلف حوالوں سے اہل علم سے مشورے لیے اور رموز کے کئی الفاظ، تراکیب اور صنائع کے بارے میں اہل فن اور اساتذہ کے نظائر پیش کیے۔ یہ سب تفصیلات مکاتیب میں موجود ہیں جو رموز بیخودی کے اس مرحلے کی دلچسپ روداد اور تحقیق کا ایک نادر موضوع ہے۔

مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

معارف میں ابھی آپ کا ریویو (مثنوی رموزِ بیخودی پر) نظر سے گذرا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

صحتِ الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے کہ دوسری ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے۔

غالباً آپ نے رموزِ بیخودی کے صفحات پر ہی نوٹ کیے ہوں گے۔ اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجیے، میں دوسری کاپی اس کے عوض میں آپ کی خدمت میں بھجوا دوں گا۔[۱۸]

۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

رموزِ بیخودی کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا، اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہو گیا، امید کہ توجہ فرمائی جائے گی، تا کہ میں دوسری ایڈیشن میں آپ کے ارشادات سے مستفید ہو سکوں۔[۱۹]

سید سلیمان ندوی کے نام مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے مگر چونکہ شاعری اِس مثنوی سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا، اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کے قوافی کی مثالیں ملتی ہیں اور ظہوری کے ساقی نامہ کے چند اشعار بھی زیرِ نظر تھے، غالباً اور مثنویوں میں بھی ایسی مثالیں ہوں گی۔[۲۰]

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۲۱ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

ستمبر کا معارف ابھی نظر سے گذرا ہے۔ اس میں مسٹر ڈکنسن کے ریویو (اسرارِ خودی) کا ترجمہ آپ نے شایع کیا ہے۔ ترجمۂ مذکور کا ایک فقرہ یہ ہے "اقبال ان تمام فلسفوں کے دشمن ہیں جو شے واجب الوجود کو تسلیم کرتے ہیں۔"

اگر آپ کے پاس رسالہ نیشن (Nation) موجود ہو جس میں انگریزی ریویو شایع ہوا تھا، تو میں اُسے

دیکھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کر کے ایک آدھ روز کے لیے بھیج دیجیے۔ مجھے ایسا خیال ہے کہ غالباً مذکورہ بالا فقرہ اس ریویو میں نہیں ہے یا اس کی جگہ کچھ اور ہے۔ مقصود یہ معلوم کرنا ہے کہ کہیں ترجمے میں سہو تو نہیں ہوگیا۔[۲۱]

۱۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں تحریر کرتے ہیں:

اسناد حسب وعدہ حاضر ہیں:

۱- ازگل غربت زماں گم کردۂ (رموز)

آپ کا ارشاد اس مصرع پر یہ تھا کہ ''ازگل'' بمعنی بدولت اچھے معنوں میں آتا ہے، بُرے معنوں میں نہیں آتا۔ بہارِ عجم میں زیرِ لفظ ''گل'' یہ محاورہ بھی دیا ہے اور اشعار بھی دیے ہیں:

زیرِ دست چرخ بودن ازگل بے فطرتی ست الخ

۲- محفلِ رنگیں بیک ساغر کند (رموز)

بہ ہفتاد و دو ملت گردشِ چشمِ تو می سازد
بیک پیمانہ رنگیں کردۂ یک شہرِ محفلہا
(ناصر علی)

۳- ''سرمۂ او دیدۂ مردم شکست'' (رموز)
چشم و گوش شکستن، یعنی نابینا وکرشدن (بہارِ عجم)
ترسم ز گریہ چشمِ گہربار بشکند الخ (صائب)

۴- عشق را داغے مثال لالہ بس
در گریبانش گل یک نالہ بس (رموز)
ترسم ز گریہ چشمِ گہربار بشکند الخ (صائب)

گل نالہ پر آپ کا ارشاد تھا

چنگے بتار نغمۂ قانونِ شیرزن
گلبرگ نالۂ بگریبانِ دل فشاں
(زلالی)

۵- ز آسمان آبگوں یم می چکد
من ز جو باریک تر می سازمش (رموز)

لفظ ''باریک'' پر آپ کا ارشاد تھا کہ صحیح نہیں، باریک بمعنی کم درعرض و عمق بھی آیا ہے:

نازک تراست از رگِ جاں گفتگوئے من
باریک شد محیط چو آمد بجوئے من
(صائب)

از تواضع می تواں مغلوب کردن خصم را
می شود باریک چو سیلاب از پل بگذرد
(زلالی)

۶- کور ذوقاں داستانہا ساختند الخ (رموز)

''کورذوق'' کی نسبت آپ کا ارشاد تھا کہ بے مزہ ترکیب ہے

چہ غم زیں عروسِ سخن را بتر
کہ بر کور ذوقاں شود جلوہ گر
(ظہوری)

کور ذوقاں ز فیضِ تربیت
چوں مسیحا مزاجدانِ سخن
(ملاطغرا)

۷- نوا بالیدن، تانوائے یک اذاں بالیدہ است (رموز)
تاچند ببالد نفس اندودنوایم (بیدل)

۸- بحر تلخ رو، بود بحرِ تلخ رو یک سادہ دشت (رموز)
تلخ رو بحر کی صفات میں آتا ہے (بہارِ عجم)

۹- نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت (رموز) منجملہ اور ارشادات کے ایک یہ ارشاد تھا کہ لفظ نعرہ شیر کے لیے ٹھیک نہیں، بہارِ عجم میں ایک شعر دیا ہے جس میں نعرۂ اسپ لکھا ہے۔

بابر ماند چو پے برنہاد و نعرہ کشاد (معز فطرت)

۱۰- سازِ برق آہنگ اونو اختہ (رموز) آپ کا ارشاد تھا کہ سازِ برق صحیح نہیں، لیکن مصرع میں ساز کی صفت برق آہنگ ہے اور برق آہنگ ساز کی صفت آتی ہے۔ (بہارِ عجم زیرِ لفظ ساز)

۱۱- ہم چو صبح آفتاب اندر قفس (رموز) آپ کا ارشاد تھا کہ صبح کے لیے آفتاب کی کیا ضرورت ہے، یہ ترکیب مرزا بیدل کی ہے، میں نے اس کے لیے محل استعمال نیا پیدا کیا ہے یعنی کعبۃ اللہ کے گرداگرد جب ملت بیضا نماز پڑھتی ہے یا طواف کرتی ہے تو یہ نظارہ صبح آفتاب در قفس سے مشابہ ہے:

ملت بیضا بہ طوفش ہم نفس
ہم چو صبحِ آفتاب اندر قفس

۱۲- اے بصیری را ردا بخشندۂ (رموز)

بصیری کے متعلق بھی یہی واقعہ مشہور ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ حضور ﷺ نے بصیری کو جو جذام میں مبتلا تھا، اپنی چادرِ مطہر خواب میں عطا فرمائی تھی جس کے اثر سے اُس نے جذام سے نجات پائی۔ بعض لوگوں میں قصیدۂ بصیری قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور ہے۔

۱۳- من شبے صدیقؓ را دیدم بخواب
گل زِ خاک راہ او چیدم بخواب

دوسرے مصرع پر آپ کا ارشاد تھا کہ مطلب زیادہ واضح ہونا چاہیے اور گل زخاکِ راہ او چیدم کیا مطلب؟ یہ واقعہ خواب کا ہے، جو خواب میں دیکھا گیا بعینہٖ اسی طرح نظم کر دیا گیا۔

۱۴- بازبانت کلمۂ توحید خواند، لفظ کلمہ کے متعلق بھی لکھوں گا۔ افسوس ہے کہ ابطالِ ضرورت دستیاب نہیں ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس رسالہ میں اس لفظ پر بحث ہے، بہت سے الفاظ جن کو اساتذہ نے بہ تحریک و بہ سکون دونوں طرح استعمال کیا ہے، انھوں نے یکجا کر دیے ہیں۔ مثلاً رب ارنی، رمضان، حرکت، متواری و قران وغیرہ، اس کا بہ سکون استعمال ہونا یقینی ہے۔ اسناد ان شاء اللہ عرض کروں گا، جواہر التراکیب میں چار دفعہ بہ سکونِ لام آیا ہے۔

۱۵- فرد و قوم آئینۂ یک دیگراند
ہم خیال و ہم نشین و ہمسراند (رموز)

لفظ ہم خیال کی نسبت آپ کو شبہ تھا

یادِ ایامیکہ باہم آشنا بودیم ما
ہم خیال و ہم صفیر و ہم نوا بودیم ما

لیکن میں نے یہ لفظ شعر سے نکال دیا ہے۔

۱۶- بائے بسم اللہ (حضرت علیؓ کے لیے) قاآنی نے لکھا ہے، اور میم مروت مولانا جامی نے تحفۃ الاحرار میں لکھا ہے۔ میں نے ''میم مرگ'' لکھا تھا۔

۱۷- قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے، قاعدہ یہی ہے جو آپ تحریر فرماتے ہیں۔ مولانا رُوم ان باتوں کی پروا نہیں کرتے، ظہوری کے دو شعر جو زیرِ نظر تھے، عرض کرتا ہوں:

گل شوقم از آب و گل بردمد
برقّاصی از سینۂ دل جهد
چو از چشمِ جادو بجادُو رود
باعجاز پہلو بہ پہلو زند

دوسرا شعر کسی قدر مشتبہ ہے، کوئی اور ایڈیشن ساقی نامہ کی دستیاب نہیں ہوئی ورنہ مقابلہ کرتا، بہرحال قاعدہ کی خلاف ورزی کیے بغیر اگر شعر لکھا جا سکتا ہو تو قاعدہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے، ان شاء اللہ ان قوانی پر نظرثانی کروں گا۔

۱۸- ورثہ، دورہ، خیال وغیرہ کے متعلق آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے لیکن ان الفاظ کے متعلق پھر بھی کچھ عرض کروں گا۔

۱۹- شاہ رمز آگاہ شد محوِ نماز
خیمہ برزد از حقیقت در مجاز
نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت
دشت و در از ہیبتش لرزندہ گشت

ان اشعار کے متعلق جو کچھ آپ کا ارشاد ہے، اس سے مولوی اصغرعلی روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اتفاق نہیں کرتے، لیکن فی الحال ان پیش کردہ اسناد سے مجھے تسکین نہیں ہوئی۔ دو چار روز تک اپنی تحقیق کا نتیجہ عرض کروں گا۔ ان اسناد کو ملاحظہ فرمائیے اور بتائیے کہ کون سی صحیح اور کون سی غلط ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۲۲]

۱۴ستمبر ۱۹۱۸ءکو اکبر الٰہ آبادی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ (انگریزی) کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے ایک ریویو دونوں مثنویوں پر لکھا ہے۔ نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر اس ریویو کی کوئی کاپی مل گئی تو ارسالِ خدمت کروں گا۔ آج زمانہ میں ایک ریویو نظر سے گذرا۔[۲۳]

۲۲ستمبر ۱۹۲۹ءکو شاطر مدراسی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

میری فارسی مثنویوں کے متعلق جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، آپ کی بندہ نوازی ہے۔ افسوس کہ دیگر مصروفیتوں کی وجہ جو کچھ مَیں چاہتا تھا نہ لکھ سکا۔ بہرحال، جو کچھ ہو گیا غنیمت ہے۔[۲۴]

مکاتیب اقبال میں ایسے حوالے بھی ملتے ہیں جہاں علامہ نے اسرار و رموز کے بعض نکات کی توضیح کی، رموز کے مضامین کا تعارف کروایا اور اپنے اس منشا کو بیان کیا جو رموز کی تصنیف کا باعث

تھا۔

قاضی نذیر احمد کے نام خط میں مورخہ ۱۲مئی ۱۹۳۷ء کو لکھتے ہیں:

میری تحریروں میں خودی کا لفظ دو معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اخلاقی اور مابعدالطبیعی ہر دو معنوں میں لفظ مذکور کی تشریح واضح طور پر کر دی گئی ہے جس میں فارسی جاننے والے کو کسی قسم کی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجیے گا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک سینکڑوں مضمون ان کے مطالب کی تشریح میں لکھے گئے ہیں۔ باوجود ان کے اگر کسی کو غلط فہمی ہو تو اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ممکن نہیں کہ سچائی کی دو قسمیں قرار دی جائیں ایک عوام کے لیے، ایک خواص کے لیے اور جو صداقت خواص کے لیے ہو، اُسے عوام پر ظاہر نہ کیا جائے۔ لیکن میرے حالات کے لیے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ میں نے مسئلہ خودی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جس کا جاننا اس زمانے کے ہندی مسلمانوں کے لیے میرے خیال میں ضروری ہے اور جس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ خودی کے متعلق تصوف کے جو دقیق مسائل ہیں، اُن سے میں نے اعراض کیا ہے۔[۲۵]

سر عبدالقادر رموز بیخودی کی وجہِ تصنیف اقبال ہی کی زبانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کہنے لگے، میں عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بڑا معترف ہوں بلکہ ایک اعتبار سے ممنون بھی ہوں۔ وہ یوں کہ جب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا، جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیش نظر ملت کا وجود نہیں۔ حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی ملت ہی میں گم ہو کر ہوتی ہے۔ بجنوری کے اس مضمون کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموز بیخودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کر دوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموزِ بیخودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموزِ بیخودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔[۲۶]

اسی طرح نیاز الدین خان کے نام ایک خط محررہ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء میں رموزِ بیخودی کے موضوع پر علامہ اقبال نے تحریر کیا:

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملّتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیّت پر ناز کرتا ہے، وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیّت کے اصول حقّہ صرف اسلام نے ہی بتائے

ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرورایام و اعصار سے متاثر نہیں ہوسکتی۔[۲۷]

الغرض اقبالیاتی ادب کا مذکورہ بالا جائزہ یہ واضح کرتا ہے کہ ہمارے علمی و ادبی سرمائے میں رموز بیخودی کی اہمیت اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتی جب تک ہم رموز کی وجہ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے اس وقت کے حالات، علامہ کے ذہنی و فکری میلانات، معاصر اہل علم کی آراء اور خود علامہ کے منشا تصنیف کو پیش نظر نہیں رکھتے۔

حواشی و حوالہ جات

۱- شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ – مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۶۱۴–۶۱۵۔
۲- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، سنگ میل پبلی کیشنز و اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۸۷–۸۸۔
۳- ایضاً۔
۴- عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲–۱۴۔
۵- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۸۷۔
۶- علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۹۔
۷- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص 262۔
۸- ایضاً، ص ۱۶۷۔
۹- شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ –مجموعہ مکاتیب اقبال، ص ۸۸–۸۹۔
۱۰- ایضاً، ص ۹۰۔
۱۱- ایضاً، ص ۹۹۔
۱۲- ایضاً، ص ۱۱۲–۱۱۳۔
۱۳- ایضاً، ص ۱۱۳۔
۱۴- ایضاً، ص ۱۹۸۔
۱۵- ایضاً، ص ۴۶۲۔
۱۶- ایضاً، ص ۴۷۲۔
۱۷- ایضاً، ص ۵۰۶–۵۰۷۔
۱۸- ایضاً، ص ۱۱۴۔
۱۹- ایضاً، ص ۱۱۶۔

۲۰- ایضاً،ص ۱۱۷۔
۲۱- ایضاً،ص ۱۳۷۔
۲۲- ایضاً،ص ۱۲۱-۱۲۵۔
۲۳- ایضاً،ص ۳۹۶۔
۲۴- ایضاً،ص ۵۷۵۔
۲۵- ایضاً،ص ۵۳۷-۵۳۸۔
۲۶- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود،ص ۲۵۸۔
۲۷- ایضاً،ص ۲۵۸۔